مولانا محمد شہاب الدین صاحب ندوی
جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

تین طلاق کا ثبوت!

قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے

تمہید | میاں بیوی کے تعلقات کی استواری تمدنی استحکام کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن جب میاں بیوی کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو وہ مفید تمدن ہونے کے بجائے اس کے لئے نہایت درجہ نقصان دہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا تعلقات کے بگاڑ کی صورت میں ان دونوں کا الگ ہو جانا ہی بہتر نظر آتا ہے۔ جس کے لئے اسلام نے طلاق کا قانون مقرر کیا ہے۔ مگر وہ اس کی بھی تاکید کرتا ہے کہ طلاق دینے سے پہلے عورت کی حالت کو دیکھو کہ وہ پاکی کی حالت میں ہے یا ماہواری کی حالت میں؟ اگر وہ ماہواری کی حالت میں ہو تو ایسے اس وقت طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس کی پاکی کی حالت کا انتظار کرنا چاہئے۔ اسی طرح اگر وہ پاکی کی حالت میں تو ہے مگر اس طہر (دو ماہواریوں کی درمیانی مدت) میں وہ اپنی عورت سے جماع کر چکا ہے تو اس طہر میں بھی طلاق دینا ناجائز بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح بیک وقت تین طلاق دینا بھی (خواہ وہ طہر کی حالت میں ہو یا حیض کی حالت میں) ناجائز اور حرام ہے۔

طلاق کا سنت طریقہ یہ ہے۔ کہ اپنی منکوحہ کو ایسے طہر کی حالت میں جس میں اس نے جماع نہ کیا ہو صرف ایک طلاق دے۔ کیونکہ اس صورت میں غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کرنے اور عورت کو پھر سے اپنی بیوی بنا کر رکھنے کا حق باقی رہتا ہے۔ مگر تین طلاق بیک وقت داغ دینے کے بعد یہ حق ساقط ہو جاتا ہے اسلام نے یہ ساری شرطیں نہایت درجہ حکمت اور سمجھ بوجھ کے ساتھ رکھی ہیں۔ جن کو ملحوظ رکھنے کے باعث اول تو طلاق واقع ہونے کی بہت کم نوبت آتی ہے لیکن اگر وہ آبھی جائے تو شرمندگی کا باعث نہیں بن سکتی۔

مگر اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسلامی شریعت کے اس مشروع و مسنون ضابطہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بیوی کو (۱) حیض کی حالت میں (۲) یا ایسے طہر میں جس میں وہ اپنی بیوی سے مباشرت کر چکا ہو (۳) یا بیک لفظ یا ایک ہی نشست میں تین طلاق دے دیتا ہے تو کیا ان تینوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی؟ تو اس مسئلے میں امت کی اکثریت جس میں صحابہ کرام، تابعین، محدثین، فقہائے اربعہ اور بڑے بڑے ائمہ سب کے سب متفق ہیں کہ ان صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور خاص کر تین طلاقوں کے بیک لفظ وقوع کے بارے میں تمام اس بات کے قائل ہیں کہ

یہ تینوں طلاقیں ناجائز اور حرام ہونے کے باوجود واقع ہو جائیں گی۔ کیونکہ ایک حرام چیز کے ارتکاب کے باعث کوئی شخص اس کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ ممنوع احکام کے ارتکاب سے فعل لغو یا باطل نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اس متفقہ مسلک سے اختلاف کرنے والے بہت کم لوگ ہیں جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے اور ان کا ظہور صحابہؓ و تابعینؒ کے ادوار کے بعد ہوا ہے۔ لہٰذا وہ ہمارے لئے قابل حجت نہیں بن سکتا۔ اگر ساتویں صدی ہجری میں علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے اس شاذ مسلک کی تائید نہ کی ہوتی تو شاید آج کسی کو اسے ایک "اختلاف" کہنے یا اس کی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت نہ رہتی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں حضرات بہت بڑے عالم اور فقیہہ تھے مگر ان کے چند فقہی "تفردات" بھی بہت مشہور ہیں۔ یعنی ان کی بعض منفرد رائیں جو ملت کے اجماعی فیصلوں یا خود فقہ حنبلی کے خلاف تھیں جس کے یہ دونوں پیرو تھے۔ اور ان کی اس انفرادیت کے چند خاص اسباب و محرکات ہیں جن پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس تفرد کو ان کے بعد والے محقق علماء نے بدلائل رد کر دیا ہے۔ اور ان میں خود حنبلی مسلک علماء بھی شامل ہیں۔

چنانچہ ابھی حال ہی میں سعودی عرب کے پایہ تخت ریاض میں اس سلسلے میں ایک تحقیقی کام ہوا ہے۔ جس میں بڑے بڑے علماء کے ایک بورڈ نے بحث و مباحثہ اور نہایت درجہ محنت و جانفشانی کے بعد پورے دلائل کی روشنی میں ائمہ اربعہ کے مسلک کو قوی اور ناقابل تردید قرار دے کر ان دونوں حضرات کی منفرد رائے کو رد کر دیا ہے یہ پوری رپورٹ "مجلۃ البحوث الاسلامیہ"، جلد ا عدد ۳ مطبوعہ ۱۳۹۳ھ میں شائع ہو چکی ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر اس کے کچھ اقتباسات مع شرح و تفصیل اور راقم سطور کے کچھ نئے دلائل کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اگر کسی کو اس بارے میں کچھ شبہات ہوں تو وہ زائل ہو جائیں۔ اس مختصر سی وضاحت کے بعد اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

قرآن سے ثبوت | بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے والے کہتے ہیں کہ اس طرح طلاق دینا چونکہ قرآنی منشا کے خلاف ہے اس لئے وہ واقع نہیں ہوتیں۔ نیز یہ کہ قرآن میں کہیں بھی بیک وقت یا ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کا ذکر نہیں ہے۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن مجید ایک حد درجہ اجمالی کلام ہے اور اس میں صرف اس قدر ہے کہ دو طلاقوں تک رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ اور یہ کہ یہ دونوں طلاقیں الگ الگ دی جانی چاہئیں (بقرہ ۲۲۹)

اگر کسی نے تیسری طلاق دے دی تو پھر "طلاق مغلظہ" واقع ہو جاتی ہے (بقرہ ۲۳۰)
لیکن یہ تصریح قرآن میں کہیں بھی نہیں ہے۔ کہ اگر کسی نے یک بارگی تین طلاقیں دے دیں تو وہ واقع نہیں ہوں گی۔

یہ قرآنی الفاظ کو زبردستی ایک زاید مفہوم پہنانا ہے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ یک بارگی تین طلاقیں دینا قرآن کے اصل منشار کے خلاف ہے مگر جہاں تک ان کے وقوع کا تعلق ہے خود قرآن کی بعض آیات کے مقتضا سے بھی (علاوہ بعض صحیح احادیث کے) یہ وقوع ثابت ہوتا ہے لہذا اس کو خلاف قرآن کہنا ایک بے جا دعویٰ ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں جہاں پر طلاق کے احکام مذکور ہیں وہیں یہ صراحت بھی موجود ہے۔

تلك حدود الله فلا تعتدوها　　یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں تم ان سے تجاوز
ومن يتعد حدود الله فاولئك　　نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے
هم الظلمون ٥　(بقرہ ۲۲۹)　　گا تو وہ ظالم ہو گا۔

چنانچہ امام مالک اور بعض دیگر علمار کی تصریح کے مطابق اس آیت کی رو سے (بطور اقتضاء النص) بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ حد سے تجاوز کرنے کا یہی مطلب ہے جو ارتکاب ظلم ہے۔ اور ظالم ہونے کا یہی مطلب ہے کہ تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان طلاقوں کے وقوع کو صحیح نہ مانا جائے۔ تو پھر کوئی شخص ظالم نہیں بن سکتا۔ (دیکھئے مجلہ مذکور صد ۱۳۳)

اور مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضہ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے بیک وقت تین طلاقیں دے دی تھیں ہی فتویٰ دیتے ہوتے کہ یہ تینوں طلاقیں واقع ہو گئیں۔ بسبب ذیل آیت کریمہ سے استدلال کیا تھا۔ کہ قرآنی نقطہ نظر سے اب بچاؤ (مخرج) کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

ومن يتق الله يجعل له　　جو اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لئے
مخرجا ٥　(طلاق ۲)　　بچاؤ کا راستہ نکالے گا۔

پھر انہوں نے فرمایا چونکہ تم اللہ سے نہیں ڈرے اس لئے تمہارے بچاؤ کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آتا۔ تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی لہذا تمہاری عورت بائن ہو گئی۔ یعنی تم سے جدا ہو گئی۔

(ابوداؤد - ۲/ ۶۴۷ - مطبوعہ حمص)

حضرت ابن عباس رض کے علاوہ حضرت علی رض اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اس معنی کی متعدد روایات ملتی ہیں جن کے ملاحظہ سے اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ قرآنی نقطہ نظر سے تین طلاقوں کا وقوع صحیح ہے۔ اور تو اور خود علامہ ابن قیم نے بھی اس نقطہ نظر کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ جو ان کا ایک ناقابل فہم فکری تضاد ہے چنانچہ موصوف ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت کے علاوہ اس معنی کی بعض دیگر روایات کو نقل کر کے تحریر کرتے ہیں کہ یہ آثار قرآنی مدلول کے مطابق ہیں:-

وهذه الآثار موافقة لما دل عليه القرآن (اغاثة اللهفان ۱/ ۲۸۳)

ظاہر ہے جب یہ احادیث و آثار صحیح ہیں اور مطابق قرآن ہیں تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے اور نزاع کس لئے ؟ ظاہر ہے کہ قرآن سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کونسی چیز ہو سکتی ہے ؟ اب گویا کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس سلسلہ میں بعض ایسی حدیثیں ہیں جن کو خواہ مخواہ ایک معمہ بنا لیا گیا ہے۔ اور صدیوں سے اس پر بحثیں ہو رہی ہیں مگر بے نتیجہ۔ لہذا اس پر ایک نئے زاویئے سے نظر ڈالی جاتی ہے۔

حدیث سے ثبوت | اب رہا معاملہ حدیثوں سے ثبوت کا تو اس سلسلے میں بعض صحیح حدیثوں کے علاوہ صحابہ کرام کے عمل اور ان کے فتاوی سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے۔ جن کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر اس سلسلے میں صرف دو اختلافی حدیثوں کی وجہ سے یہ مسئلہ "نزاعی" بن گیا ہے۔ اور ان دو حدیثوں کو لے کر تین طلاقوں کو ایک قرار دینے والے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ گویا کہ بہت بڑی سند ہاتھ آ گئی ہے۔

چنانچہ پہلے یہ دو اختلافی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں اور پھر عقلی و معنوی اعتبار سے ان دونوں کا رد خود مزید دو حدیثوں سے کر کے اس بحث کا خاتمہ کیا جاتا ہے جس کے بعد مزید کسی لب کشائی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ان میں سے پہلی حدیث "حدیث رکانہ" اور دوسری "حدیث طاؤس" کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ دونوں حدیثیں تین کو ایک قرار دینے والوں کی سب سے بڑی دلیلیں ہیں۔

۱۔ چنانچہ حدیث رکانہ دو طرح سے مروی ہے:-

ایک میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو (اہل عرب کے رواج کے مطابق) "طلاق البتہ" یعنی قطعی طلاق دی تھی۔ اور اس قسم کی طلاق میں اعتبار نیت کا ہوتا ہے۔ اگر ایک کی نیت ہو تو ایک طلاق پڑتی ہے۔ اور تین کی ہو تو تین۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قسم دے کر پوچھا کہ اس سے تمہاری نیت کیا تھی ؟ تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ ایک کی نیت تھی۔ لہذا آپ نے صحابی کے بیان کو تسلیم کرتے ہوئے بیوی لوٹا دی۔ مگر دوسری روایت میں آتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی تھیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو ایک ہے (ابوداؤد)

ان دونوں روایتوں پر محدثین نے خوب جرح کی ہے اور ان میں سے بعض ناقدین پہلی روایت کو صحیح اور دوسری روایت کو ضعیف بتاتے ہیں۔ مگر بعض اس کے برعکس بھی کہتے ہیں۔ لہذا ہر مسلک کا طرفدار اپنے مسلک کی تائید کے لئے ان میں سے موافقانہ اقوال سے استدلال کرتا ہے اور مخالفانہ مسلک کو غلط بتاتا ہے۔ مگر صدیوں کی بحث کے باوجود اب تک فیصلہ نہیں ہو پایا۔ کہ کس روایت کو قوی اور قابل حجت مانا جائے ؟ کیونکہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک پر اڑا ہوا ہے۔ لہذا اب بحث کا طریقہ موجودہ دور کے مزاج کے مطابق یہ ہونا چاہیئے کہ بجائے سند یا روایت پر گفتگو کرنے کے "درایت" یعنی حدیث کی معنویت پر بحث کی جائے اور دیکھا جائے کہ عقلی و منطقی اعتبار سے کس حدیث کا مفہوم زیادہ صحیح ہو سکتا ہے۔ جو تمام "نصوص شریعت" سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے اور ان میں کسی قسم

تعارض و تضاد باقی نہ رہ جائے۔ اس لحاظ سے اب حدیثوں کی سندوں کو نظر انداز کر کے محض ان کی معنویت پر بحث کی جاتی ہے اور اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۲۔ اب رہی حدیث طاؤس تو وہ اس طرح مروی ہے:۔

"حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کیا آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نیز خلافت عمرؓ کے تین سال تک تین کو ایک قرار دیا جاتا تھا؟ ابن عباسؓ نے فرمایا ہاں"۔ (مسلم ۲/۱۰۹۹، مطبوعہ ریاض)

یہ حدیث بعض روایات میں کچھ دوسرے الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے اور اس حدیث کی سند اور متن دونوں کے "اضطراب" (تعارض) اور "شذوذ" (انفرادیت) پر ائمہ حدیث نے کافی کلام کیا ہے۔ جس سے حدیث و فقہ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر ان تمام طویل بحثوں کو نظر انداز کر کے ان دونوں کی "حجیت" پر ایک نئے انداز سے کلام کیا جاتا ہے چنانچہ ان دونوں کی تردید کے لئے حسب ذیل دو حدیثیں کافی ہیں۔

۱۔ امام نسائی محمود بن لبید سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ غضب ناک ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھیلا جائے گا جب کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں؟ اس پر ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور کہا یا رسول اللہ کیا میں اس شخص کو قتل کر دوں؟ (سنن نسائی ۶/۱۴۲، مطبوعہ بیروت)

اب دیکھئے اس حدیث اور مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں کس قدر شدید تعارض واقع ہوا ہے۔ اس حدیث کے مطابق ایک تو آپ انتہائی شدید ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ اس فعل کو کتاب اللہ کے ساتھ ایک مذاق بھی قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ اس سخت ناراضگی اور ملامت کے باعث بعض صحابہ اس شخص کو قتل کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں جس نے بیک وقت تین طلاقیں دی تھیں۔ لہٰذا اگر ماقبل کی دونوں حدیثیں صحیح ہیں تو پھر اس قدر شدت و سختی کے آخر کیا معنی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ کو کہنا چاہئے تھا کہ چلو کوئی مضائقہ نہیں "تین ایک ہو گئیں"، مگر ایسا کوئی لفظ اس میں موجود نہیں ہے جس کے مطابق پہلی دو حدیثیں صحیح ثابت ہو سکتی ہوں۔ جیسا کہ ان میں کہا گیا ہے۔ کہ دور رسالت اور دور ابوبکرؓ میں تین کو ایک قرار دینے کا مجموعی رواج تھا۔ اور اس پر کوئی نکیر یا ملامت بالکل نہیں ہوتی تھی۔ (حدیث طاؤس سے یہی مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے) ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی بات درست ہو سکتی ہے۔ اور عقلی اعتبار سے ان دونوں کو صحیح مان لینا ایک زبردست قسم کا تضاد ہو گا۔ صاف بات ہے کہ جو چیز کتاب اللہ کے ساتھ ایک کھیل یا مذاق ہو وہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی اباحت کا فتوی صادر نہیں کیا جا سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی روایت صحیح ہے؟ تو نسائی والی روایت کو متعدد محدثین کے

علاوہ خود ابن قیم نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ اور بقیہ دونوں حدیثوں پر شدید جرح کی گئی ہے۔ لہذا وہ دونوں قابلِ حجت نہیں رہیں۔ مگر معنوی اعتبار سے "البتہ" والی روایت قابلِ حجت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں اور نسائی والی روایت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

نیز نسائی والی روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ اسی بنا پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا۔ ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اس قدر شدید ناراضگی کی کوئی دوسری وجہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تین طلاقوں کو تین قرار دیا جاتا تھا نہ کہ ایک۔ اور اس کی تائید بعض دیگر حدیثوں کے علاوہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

۲۔ حدیث طاؤس کی تردید میں دوسری حدیث خصوصیت کے ساتھ "حدیث عائشہؓ" بھی پیش کی جا سکتی ہے جو اس سلسلے میں نہایت درجہ اہم ہے چنانچہ یہ حدیث بخاری و مسلم میں اس طرح آئی ہے:۔

"حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کر لیا۔ مگر اس نے ہمبستری سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی۔ تو پہلے شوہر نے اس سے دوبارہ نکاح کا ارادہ کیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا:۔

"جب تک دوسرا شخص بھی پہلے ہی کی طرح اس عورت سے ہمبستری نہ کرے اس وقت تک وہ عورت پہلے شخص کے لئے حلال نہیں ہو سکتی" (بخاری ۶/ ۱۶۵، مسلم ۲/ ۱۰۵۷)

اس حدیث میں جس طرح مذکور ہے اس نے "تین طلاقیں" دی تھیں (اصل الفاظ طَلَّقَ ثَلَاثًا) بالکل اسی طرح حدیث طاؤس میں بھی (الطَّلَاقُ الثَّلَاثُ) کے الفاظ آئے ہیں۔ مگر ان دونوں میں کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ طلاقیں بیک لفظ مراد ہیں۔ یا متفرق طور پر؟ مگر علامہ ابن قیم نے بلاوجہ فرض کیا ہے کہ حدیث عائشہ میں تین طلاق متفرق طور پر دینا مراد ہے اور حدیث طاؤس میں اکٹھا طور پر۔ جب کہ اس کی کوئی دلیل سرے سے ان کے پاس موجود نہیں۔ بلکہ یہ ان کا ایک تضاد اور دوہرا معیار ہے جو حد درجہ تعجب خیز ہے کہ ابن قیم جیسے نکتہ رس عالم کی نظر سے یہ نکتہ کیسے پوشیدہ رہ گیا؟ چنانچہ حدیث عائشہ رضؓ کے بارے میں انہوں نے جس نکتہ رسی کا اظہار فرمایا ہے وہ خود ان پر بھی عائد ہوتا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ وہ پوچھتے ہیں:۔

"ولکن این فی الحدیث انہ طلق الثلاث بفم واحد" یعنی حدیث میں یہ بات کہاں مذکور ہے کہ اس شخص نے تین طلاقیں ایک منہ سے یعنی بیک لفظ دی تھیں؟ (زاد المعاد ۵/ ۲۶۱ جدید ایڈیشن ۱۹۸۵ء)

اب سوال یہ ہے کہ جب حدیث عائشہ رضؓ میں اس کی تصریح موجود نہیں ہے تو پھر حدیث طاؤس میں اس کی کہاں

موجود ہے کہ یہ تینوں طلاقیں "بفمٍ واحدٍ" (بیک لفظ) تھیں؟ اگر علامہ موصوف اپنی کتابوں میں اس مسئلے پر لمبی چوڑی بحث کرنے اور کلام کو خواہ مخواہ طول دینے کے بجائے صرف اسی ایک نکتے کی وضاحت کر دیتے تو یہ ایک بہت بڑی علمی خدمت ہوتی اور بحث کا خاتمہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ مگر یہی ایک کام ہے جس کو انہوں نے نہیں کیا۔ اور بحث کو خواہ مخواہ طول دے کر اپنے بعد والوں کے لئے ایک جھگڑا کھڑا کر دیا۔

اب اس مسئلے پر فیصلہ کن طریقے سے بحث کرنے کے لئے عقلی اعتبار سے چار شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں؛ ان چاروں صورتوں میں حدیث طاؤس ساقط الاعتبار قرار پائے گی۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ یہ فرض کیا جائے کہ حدیث عائشہ رضؓ اور حدیث طاؤس دونوں میں تین طلاق بیک لفظ دینا مراد ہو۔ اس صورت میں حدیث عائشہؓ کو ترجیح ہوگی۔ کیونکہ ایک تو وہ بخاری و مسلم کی متفقہ حدیث ہے اور دوسرے اس میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ تین طلاقوں کے بعد عورت دوسرا خاوند کئے بغیر پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں رہتی۔ لہٰذا اس صورت میں حدیث طاؤس سے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو وہ بخاری و مسلم کی متفقہ حدیث نہیں ہے اور دوسرے اس کی حیثیت امت کے درمیان سخت اختلافی بھی ہے۔

۲۔ یوں فرض کیا جائے کہ ان دونوں حدیثوں میں تین طلاقیں متفرق طور پر دینا مراد ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ حدیث طاؤس قابلِ استدلال نہیں رہی۔ کیونکہ سارا جھگڑا اور اختلاف تین طلاقوں کو بیک لفظ دینے سے متعلق ہے۔ لہٰذا اگر متفرق طور پر دینا تسلیم کر لیا جائے تو یہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے:

۳۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حدیث عائشہ رضؓ میں متفرق طور پر دینا مراد ہو۔ اور حدیث طاؤس میں اکٹھا دینا مراد ہو۔ تو یہ بات بلا دلیل و بلا سند ہونے کی بنا پر مردود اور باطل ہوگی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک من مانا استدلال اور دوہرا معیار ہوگا جس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔

۴۔ اور چوتھی صورت یوں فرض کی جا سکتی ہے کہ حدیث عائشہ رضؓ میں تین طلاقیں اکٹھا طور پر اور حدیث طاؤس میں متفرق طور پر دینا مراد ہو۔ تو اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے اور بڑے بڑے علماء کے علاوہ خود ائمہ حدیث مثلاً امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ وغیرہ نے بھی اس کی یہی تاویل کرتے ہوئے حدیث طاؤس کو "غیر مدخول بہا" (وہ منکوحہ عورت جس سے شب باشی نہ کی گئی ہو) پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ خود اسی سلسلے کی بعض روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ یعنی جب کوئی شخص غیر مدخول بہا سے یوں کہے کہ:۔

"تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے" تو اس سے صرف ایک طلاق پڑے گی۔ کیونکہ ایسی عورت پہلی طلاق کے ساتھ ہی بائن (جدا) ہو جاتی ہے اور باقی دو طلاقیں لغو قرار پاتی ہیں۔

ایک وضاحت۔ اس مختصر گفتگو سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حدیث رکانہ اور حدیث طاؤس شدید

تعارض و اضطراب کی بنا پر قابلِ حجت نہیں ہیں جو شریعت کے دوسرے نصوص سے میل نہیں کھاتیں۔

واضح رہے کہ اس موقع پر حدیث عائشہؓ کے نام سے جو حدیث اوپر مذکور ہے وہ فاطمہ بنت قیس والی حدیث نہیں جن کے شوہر کا نام رفاعہ قرظی تھا بلکہ وہ ایک دوسرے شخص سے متعلق ہے جن کا نام رفاعہ نضری تھا اور ان دونوں کا واقعہ ایک جیسا ہے اور مزید یہ کہ ان دونوں مطلقہ عورتوں سے عبدالرحمٰن بن زبیر نے نکاح کیا تھا۔ اور یہ دونوں حدیثیں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہیں۔ لہٰذا بعض لوگوں کو اس سے اشتباہ ہو گیا۔ اور انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ اور مزید یہ کہ فاطمہ بنت قیس سے متعلق بعض دیگر روایات کی تصریح موجود ہے کہ ان کے شوہر نے انہیں یمن جاتے وقت تیسری اور آخری طلاق دی تھی۔ لہٰذا یہ تینوں طلاقیں متفرق طور پر تھیں نہ کہ اکٹھی۔ مگر مذکورہ بالا تفصیل سے یہ اشتباہ پوری طرح زائل ہو جاتا ہے

تفصیل کے لئے دیکھئے حافظ ابن حجر کی بخاری شریف کی شرح فتح الباری میں (جلد ۹ ص ۳۶۷ و ۴۰۳ اور ۴۰۴ مطبوعہ ریاض)

محدثین کا مسلک اس موقع پر یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ امام بخاری نے ان دونوں حدیثوں (رفاعہ قرظی اور رفاعہ نضری) کو ایک ہی باب میں درج کیا ہے۔ اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ حدیثیں ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ امام بخاری کے نزدیک بیک وقت دی ہوئی تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ یہی بات ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ان حدیثوں کو درج کیا ہے۔ اور باب کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے

"باب من اجاز الطلاق الثلاث" یعنی سلف میں جن بزرگوں نے تین طلاق کے وقوع کو جائز قرار دیا ہے اس کا بیان۔ اس عنوان کے تحت امام بخاری کے نزدیک فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے بھی تین طلاقوں کا وقوع ثابت ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ امام بخاری ایک بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے مجتہد رس فقیہ بھی تھے چنانچہ ان کی یہ عادت ہے کہ اگر کسی حدیث سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے تو وہ اسے عنوان باب بنا دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے گویا کسی باب کا عنوان ان کے فقہی مسلک کا ترجمان ہوتا ہے۔

غرض امام بخاری جیسے رئیس المحدثین کے نزدیک سنت رسولؐ کی رو سے بیک وقت تین طلاقوں کا وقوع ثابت ہے۔ اور یہی مسلک صحاح ستہ کے اکثر مؤلفین کا بھی ہے۔ خصوصاً امام ابوداؤد اور امام نسائی امام بخاری ہی کی طرح تین طلاقوں کے وقوع کا واضح مسلک رکھتے ہیں اور اس موضوع پر راقم سطور نے ایک علیحدہ مضمون تحریر کیا ہے۔

اجماع سے ثبوت قرآن اور حدیث کے بعد اب "اجماع" (کسی ایک دور کے اہل علم کا متفقہ مسلک) کی طرف آیئے تو معلوم ہو گا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں تین ہوتی ہیں نہ کہ ایک۔ چنانچہ امام شافعی، علامہ جصاص رازی، ابوالولید باجی، قاضی ابن العربی اور علامہ ابن رجب وغیرہ بڑے بڑے

علما اس بات کے قائل ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اس مسئلے پر اجماع ہو چکا ہے لہٰذا ایک "خبر واحد" (ایک ہی فرد سے مروی روایت۔ جو صرف طاؤس سے مروی ہے اور کسی دوسری روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ تعارض ثابت ہوتا ہے) کو اجماعِ امت پر مقدم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اجماع کو خبرِ واحد پر مقدم کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ خبرِ واحد میں غلطی اور وہم کا امکان موجود ہے جب کہ اجماع میں اس کا امکان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام صحابہ کرام کے عمل اور فیصلے پر حرف آئے گا۔ مگر صحابہ کرامؓ کے اس متفقہ عمل اور فیصلے کو محض حضرت عمرؓ کا ایک تعزیری اقدام قرار دینا ایک بھونڈی تاویل ہے۔

بہر حال علامہ ابوبکر جصّاص رازی فرماتے ہیں کہ:۔

"قرآن، حدیث اور اجماعِ سلف سے اکٹھی دی ہوئی تین طلاقوں کا وقوع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایسا کرنا گناہ ہے"

(احکام القرآن ۱/۳۸۸، مطبوعہ بیروت)

"قاضی ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین کے دور میں اس مسئلے میں کوئی اختلاف ہی نہیں تھا سوائے ان لوگوں کے جن کا درجہ تابعین سے کمتر تھا۔ چنانچہ صحابہ اور تابعین کے ادوار میں تین طلاق کے وقوع پر اتفاق پایا جاتا تھا اور تم اس مسئلے میں سلف کی طرف کوئی خلاف بات منسوب کی ہوئی ہرگز نہ پاؤ گے (الناسخ والمنسوخ)

اور ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ سلف میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی جن کے فتاویٰ کا حلال حرام میں اعتبار کیا جاتا ہے، یہ بات صراحت کے ساتھ پائی نہیں جاتی کہ جس عورت سے مباشرت کی جا چکی ہو اسے اگر بلفظ تین طلاق دی جائے تو وہ ایک شمار ہوگی (مجلۃ البحوث الاسلامیہ صہ ۸۱)

اگرچہ ابن تیمیہ اور بعض دیگر اصحاب نے اس قسم کے اجماع کا انکار کیا ہے۔ مگر خود علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم تک کو بھی اعتراف ہے کہ یہ جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک تھا۔ چنانچہ ابن تیمیہ تحریر کرتے ہیں:۔

وھو قول مالك . وابي حنيفه واحمد وهذا القول منقول عن كثير من السلف من الصحابه والتابعين . (فتاوی ابن تیمیه ۳۳/۸)

اور ابن قیم تحریر کرتے ہیں:

وھذا قول الائمة الاربعة وجمهور التابعين وكثير من الصحابه رضی الله عنهم

(زاد المعاد ۵/۲۴۷)

یہ دونوں حضرات صحابہ اور تابعین کے لئے "جمہور" اور "کثیر" کے الفاظ اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک بعض صحابہ اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا نام لیتے ہیں۔ مگر صحیح روایات کی رو سے یہ بات ثابت نہیں ہے بلکہ علمائے محققین کا دعویٰ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی طرف اس کی نسبت بالکل

غلط ہے اور اس کو خود ابن قیم بھی تسلیم کرتے ہیں (دیکھئے اغاثۃ اللہفان ۱/۳۳۰)

اور تابعین میں سوائے طاؤس اور عکرمہ کے اور کوئی بھی اس کا قائل نہیں تھا۔ مگر یہ حضرات بھی (خاص کر طاؤس) اس کو غیر مدخول بہا پر محمول کرتے تھے۔ خود علامہ قیم نے اس کا اعتراف کیا ہے (دیکھئے حوالہ مذکور ص ۳۲۴) اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن قیم نے کتاب مذکور (صفحات ۳۲۴ تا ۳۲۹) میں جتنے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے وہ سب تابعین کے درجے سے نیچے کے لوگ ہیں اور ان میں بھی اکثریت اس کو مطلقاً نہیں بلکہ غیر مدخول بہا سے متعلق قرار دیتی ہے۔ لہذا اس سے اجماع کی قطعیت متاثر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ محض ایک ادّعائی بیان اور خواہ مخواہ قسم کا "نزاع" ہے جس کی حیثیت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔

غرض علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی نظر میں اگر اجماع ثابت بھی نہ ہو تو حجت کے لئے یہ بات کیا کم ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کی اکثریت جس مسئلے پر متفق ہو جائے وہ قابلِ عمل اور قابلِ حجت کیوں نہیں بن سکتا؟ اور ان کی عظیم ترین اکثریت کے مقابلے میں ایک یا دو افراد کا اختلاف حجت کیسے بن سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا اصول ہے جو ایک معمولی درجے کے شخص کی سمجھ میں بھی بہ آسانی آسکتا ہے اور اس پر لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:۔

"میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہیں ہو سکتی۔ لہذا جب تم امت میں اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم یعنی اکثریت کے ساتھ ہو جاؤ۔" (ابن ماجہ)

حاصل کلام یہ کہ ایک اجماعی مسئلہ محض چند گنے چنے افراد کے اختلاف کے باعث "نزاعی" ہرگز نہیں بن سکتا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ طبقۂ صحابہ میں اس کا کوئی بھی مخالف نہ ہو۔ اور خود علامہ ابن قیم نے اس سلسلے میں بعض علماء کا ایک قول فیصل اس طرح نقل کیا ہے:۔

"جس شخص نے اپنی بیوی سے یوں کہا کہ تجھے تین طلاق ہے تو جمہور کے مسلک کے مطابق اس سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اسی پر فیصلہ ہے، اسی پر فتوی ہے اور یہی قول بلاشبہ حق ہے۔" (اغاثۃ اللہفان ۱/۳۲۶)

قیاس سے ثبوت | یک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے والے کہتے ہیں:۔

چونکہ اس طرح طلاق دینا بدعت اور حرام ہے اس لئے وہ واقع نہیں ہو سکتیں۔ گویا کہ کوئی غیر شرعی فعل سرے سے واقع ہی نہیں ہوتا حالانکہ یہ بات نہ صرف شرعی حیثیت سے بلکہ عقلی حیثیت سے بھی غلط اور مہمل ہے۔ شرعی حیثیت سے اس طرح کہ جب کوئی بات قرآن اور حدیث سے ثابت ہو جائے تو پھر اس میں رائے و قیاس سے کام لینا یا عقلی گھوڑے دوڑانا بالکل ناجائز اور باطل ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث کے احکام محض اپنے قیاس سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ خود علامہ ابن قیم نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا ہے بلکہ وہ اس کے بہت بڑے داعی و علمبردار ہیں۔ چنانچہ موصوف

اس سلسلے میں اپنی کتاب "اعلام الموقعین" جلد اول میں "رائے باطل" کے عنوان کے تحت جو کچھ تحریر کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں "نصوص" کے مقابلے میں مجرد رائے کی شدید مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ بعض ائمہ کا اصول یہ ہے کہ وہ اپنی رائے کے مقابلے میں ضعیف احادیث تک کو ترجیح دینے کے قائل ہیں۔

اور عقلی حیثیت سے اس طرح کہ کسی فعل کے غیر شرعی یا بدعت وحرام ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فعل سرے سے لغو اور باطل ہو جائے۔

بہرحال پچھلے مباحث سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ بیک وقت تین طلاق دینا اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہرگز نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ مگر جب کوئی شخص اس کا مرتکب ہو ہی جائے تو وہ فعل اپنی جگہ پر ضرور واقع ہو جائے گا۔ لغو یا باطل نہیں ہوگا۔ قرآن اور حدیث اس کے وقوع پر متفق ہیں اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے اور اس کو موافق عقل بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ خلاف قیاس نہیں ہے بلکہ مخالفین کے قیاس سے زیادہ بہتر قیاس سے اس سے اثبات ہو سکتا ہے جب کہ مخالفین کا قیاس قرآن اور حدیث کے خلاف ہونے کی حیثیت سے قابل حجت نہیں ہے۔

چنانچہ اس موقعہ ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ ممنوعات کے ارتکاب سے فعل واقع ہوتا ہے یا نہیں؟ تو جواب کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو واقع ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آدھا یا ۱/۳ تو واقع ہو مگر آدھا یا ۲/۳ واقع نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا کہنا غیر معقول اور خلاف عقل بات ہے۔ اس اعتبار سے تین کو ایک قرار دینے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فعل ۱/۳ (ایک تہائی) واقع ہوا ہے اور ۲/۳ (دو تہائی) واقع نہیں ہوا۔ لہذا یہ ایک غیر معقول بات ہے۔

اس اعتبار سے تین کو تین قرار دینا ہی قرین قیاس ہے۔ اور کتاب اللہ یا احکام شریعت کی خلاف ورزی سے فعل کالعدم نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جس طرح تین طلاقوں کو بیک وقت دینے سے منع کیا بالکل اسی طرح "ظہار" (اپنی منکوحہ بیوی کو اپنی ماں سے تشبیہ دینے) سے بھی منع کیا ہے اور اس فعل کو "منکر" اور "قول زور" یعنی جھوٹی بات کہا ہے (مجادلہ ۲۰)

مگر اس کے باوجود ظہار کرنے والا شخص منکر اور جھوٹ کا مرتکب ہو جاتا ہے اور وہ سزا سے بچ نہیں سکتا بلکہ اس پر کفارہ عائد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تین طلاق کا مرتکب بھی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو مہمل یا کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس فعل کو کالعدم قرار دینے کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ ایک طلاق بھی واقع نہ ہو جیسا کہ شیعوں کا مسلک ہے (حالانکہ یہ بھی خلاف عقل ہے) اس اعتبار سے یہ ایک زبردست قسم کا عقلی تضاد اور غیر معقول رویہ ہے جس کو دنیا کی کوئی منطق جائز قرار نہیں دے سکتی۔

دوسری مثال لیجئے۔ اسلام کے دائرہ سے نکل جانا (مرتد ہونا) اللہ کی نافرمانی ہے۔ مگر اس کا ارتکاب اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے اور اس کی بیوی کو اس سے جدا کرنے سے روک نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص مرتد

ہو جائے تو اس کی بیوی کا نکاح ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ اس شخص پر حرام ہو جاتی ہے) یہی حال تین طلاقوں کے وقوع کا بھی ہے (ماخوذ از احکام القرآن، جصاص ۱/۳۸۷)

تیسری مثال لیجئے جو خود طلاق اور رجعت کے سلسلے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

"اور تم اپنی عورتوں کو تکلیف دینے کی غرض سے روک کر نہ رکھو" (بقرہ ۲۳۱)

یعنی رجعی دینے کے بعد جب عورت کی عدت ختم ہونے کو آئے تو پھر یا تو اسے شرافت کے ساتھ رخصت کر دینا ہے یا پھر شرافت کے ساتھ رجوع کر کے اپنی مطلقہ کو پھر سے بیوی بنا لینا ہے۔ مگر یہ بات جائز نہیں ہے کہ عورت کو خواہ مخواہ تکلیف دینے کی غرض سے طلاق سے تو رجوع کرے مگر اسے پھر سے بیوی بنا کر اس کے حقوق ادا نہ کرے۔ اس طرح کا فعل اللہ کی نظر میں ایک معاشرتی گناہ ہے۔ مگر اس کے باوجود جب کوئی شخص ایسا کر ہی بیٹھے تو پھر اس کا حکم ثابت ہو جائے گا اور رجعت صحیح قرار پائے گی۔ کیونکہ ممنوعات کے ارتکاب سے فعل باطل نہیں ہو سکتا (ماخوذ از حوالہ سابق)

چوتھی مثال۔ اسلام میں زنا کرنا یا کسی کو ناحق قتل کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے مگر اس کا مرتکب ظاہر ہے سزا سے بچ نہیں سکتا بلکہ اس پر شرعی حد جاری ہو جاتی ہے۔ یہی حال دیگر تمام "حدود" شرعی کا ہے کہ فعل حرام سے حدود ساقط نہیں ہوتیں۔

اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایک سادہ سی مثال لیجئے۔

اگر کسی کے ذمہ بطور قرض تین روپے باقی ہوں اور اسے ہر مہینہ ایک ایک روپیہ قسط وار ادا کرنے کی سہولت دی گئی ہو۔ مگر وہ تینوں روپے ایک ہی مہینے میں بیک بارگی ادا کر دے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے صرف ایک روپیہ ادا کیا ہے یا کچھ بھی ادا نہیں کیا؟ اسی طرح ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو تمہارے سامنے تین پھل رکھے ہوئے ہیں انہیں ایک دن میں ایک ایک کر کے کھاؤ ورنہ نہ صرف یہ کہ بدہضمی ہو جائے گی بلکہ تم کو سزا بھی دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ تینوں پھل یک ساتھ یا ایک ہی دن میں کھالے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے صرف ایک ہی پھل کھایا ہے یا سرے سے کچھ کھایا ہی نہیں ہے؟ اسی طرح اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ تم وقفے وقفے کے ساتھ تین فائر کرو۔ مگر اس نے تینوں فائر یک بارگی تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس نے صرف ایک ہی فائر کیا ہے؟ اس منطق کا جواز کیا ہے؟ ہاں البتہ ایسا شخص حکم عدولی کا مجرم ضرور قرار پائے گا اور تمام ائمہ یہی کہتے ہیں اور اس کی شرعی سزا یہ ہے کہ ایسے شخص کی منکوحہ بیوی اس سے جدا (بائن) ہو جائے گی۔ کیونکہ شریعت نے اسے طلاق کا حق سوچ سمجھ کر دینے کی غرض سے عطا کیا تھا اور اسے کافی مہلتیں اور سہولتیں عطا کی تھیں۔ مگر جب وہ شریعت کی عطا کردہ سہولتوں اور مصلحتوں کو پوری طرح نظر انداز بلکہ پامال کرتے ہوئے اپنے پورے اختیار کو یکبارگی استعمال کرنے ہی پر مصر ہے تو پھر یہ چیز واقع ہو کر رہے گی۔ اور وہ اختیار جو شریعت نے عطا کیا تھا (یعنی ایک ایک طلاق کر کے دینے کی صورت

ہیں اسے رجوع کرنے کا حق باقی رہتا ہے) وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور جب یہ اختیار ایک بار اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر وہ دوبارہ اسے اس وقت تک واپس نہیں مل سکتا جب تک کہ اس کی مطلّقہ عورت کسی دوسرے شوہر کا مزہ نہ دیکھ لے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص نے اپنا یہ اختیار (جو اسے شریعت نے نہایت درجہ حکمت اور دانائی کے ساتھ عطا کیا تھا) خود اپنے ہی ہاتھ سے گنوا لیا ہے تو ایسا شخص حکم عدولی کی سزا سے کس طرح بچ سکتا ہے؟ وہ اپنے لئے رعایت کس طرح طلب کر سکتا ہے؟

بقول حضرت ابن عباسؓ:۔ "تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی لہٰذا تمہاری عورت تم سے جدا ہو گئی اب تمہارے بچاؤ کا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔"

اور اس موقع پر قانون سے ناواقفیت کا بہانہ کرنا ایک بے جا اور مہمل بات ہے۔ ظاہر ہے کہ ناواقفیت کے باعث قانون معطل نہیں کیا جا سکتا یا اس میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح تو قانون اور شریعت ایک کھیل تماشہ بلکہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

اب رہی یہ دلیل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

مَنْ احدث فِی امرِنا ھٰذا ما لیس مِنہُ فھو رَدٌّ — جس نے ہماری شریعت میں کوئی نئی بات پیدا کی تو وہ مردود ہے۔

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ فعل سرے سے کالعدم ہو گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو مشروعیت حاصل نہیں ہو سکتی ورنہ تین طلاقیں دینے کا رجحان تو خود دور رسالت میں بھی موجود رہا ہے مگر اس سے فعل باطل یا لغو نہیں ہوا جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ محمود بن لبید اور حضرت عائشہؓ کی حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے (یہ دونوں حدیثیں اوپر گذر چکی ہیں)

نکاح ایک عمرانی معاہدہ ہے جسے دیگر معاہدوں کی طرح فسخ کرنا صحیح ہے۔ چنانچہ اسے جس طرح متفرق طور پر منسوخ کیا جا سکتا ہے اور شرعی و عقلی اعتبار سے اس کے عدم وقوع پر دلالت کرنے والی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ اس قسم کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ جس طرح سنجیدگی یا مذاق کی وجہ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے اسی طرح سنجیدگی یا مذاق کی وجہ سے طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ اور اس اعتبار سے نکاح اور طلاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث سے یہ دونوں باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں۔

ثلاثٌ جِدُّھنّ جِدٌّ وھزلُھنّ جِدٌّ۔ النّکاح والطّلاق والرّجعۃ — تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے۔ نکاح، طلاق اور رجعت

(ترمذی ۳/۴۹۰، مطبوعہ بیروت)

حرفِ آخر۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی استواری ایک خاندان اور معاشرے کی تعمیر میں نہایت درجہ

اہم حیثیت کی حامل ہے ۔مگر طلاق کا معاملہ ان خاندانی اور معاشرتی تعلقات کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے ۔ لہذا طلاق کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے ۔کہ کوئی شخص اس کو جس طرح چاہے استعمال کرنے لگ جائے ۔کیونکہ اسے طلاق دینے سے پہلے طلاق کے عواقب ونتائج پر ہزار بار سوچ لینا چاہیئے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے ۔یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ لوگ طلاق دینے سے پہلے علماء یا سمجھدار لوگوں سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ تین طلاق دے کر ان سے رجوع کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کس طرح پھر سے اپنی مطلّقہ کو بیوی بنا کر رکھنے کی اجازت مل جائے ۔لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کی اجازت دینا علماء کے اختیار میں نہیں ہے ۔کوئی عالم خدا کی حرام کردہ چیز کو حلال یا حلال کردہ چیز کو حرام نہیں کر سکتا ۔

علامہ ابن قیمؒ نے سورہ نساء کی آیات ۱۲۷ اور ۱۷۶ (اللہ یفتیکم ۔ اللہ فتویٰ دیتا ہے) سے استدلال کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ (شریعت کے معاملات میں) فتویٰ دینے والے حضرات اپنے فتاویٰ میں دراصل رب العالمین کی نیابت کرتے ہیں (اور اس اعتبار سے اصل مفتی گویا کہ اللہ تعالیٰ ہے ۔ اور مفتی صاحبان کی حیثیت شرع شریف یا قانون خداوندی کی طرف وضاحت کرنا ہے) گویا کہ وہ رب العالمین کی طرف سے (فتاویٰ الٰہیہ پر) دستخط کرنے والے ہیں (اعلام الموقعین ۱/۱)

علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب کا نام « اعلام الموقعین » جو رکھا ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں « اللہ کی حاکمیت پر دستخط کرنے والے » لہذا صاف ظاہر ہے کہ علمائے کرام ایک ایسی چیز پر دستخط نہیں کر سکتے جو شریعت الٰہی کے کسی حکم کو بدل دینے والی ہو ۔

اس موقعہ پر یہ بات بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ قانون سے جہل یا ناواقفیت کے باعث قانون بدل نہیں سکتا ۔ اور نہ کوئی شخص قانون سے ناواقفیت کا بہانہ کر کے مقررہ سزا سے بچ سکتا ہے ۔اس کو کسی بھی ملک یا قوم کا دستور جائز قرار نہیں دے سکتا چاہے وہ دیوانی قانون ہو یا فوجداری ضابطہ ۔

قانون اس لئے بنایا جاتا ہے کہ معاشرے کو اس پر چلایا جائے اور اسے قانون کا پابند بنایا جائے ۔اور اس اعتبار سے معاشرہ قانون کا پابند ہے ۔مگر قانون معاشرے کا پابند نہیں ہو سکتا ۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ وہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہو ۔مگر اب امت میں بعض تحریکیں ایسی چل رہی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ امت کا یہ چودہ سو سالہ متفقہ قانون بدل دیا جائے ۔اور علماء سے اس مسئلے میں نظر ثانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے ۔لیکن اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہو گیا کہ علماء کو اس قسم کا اختیار سرے سے حاصل نہیں ہے کیونکہ اس قسم کا اقدام نہ صرف قرآن اور سنت رسولؐ کے خلاف ہے بلکہ وہ اجماع امت سے بھی ایک انحراف ہے ۔اصول فقہ کی رو سے شرعی قانون کا مآخذ چار چیزیں ہیں ۔ قرآن ، حدیث ، اجماع اور قیاس اور ان چاروں چیزوں سے تین طلاق کا وقوع ثابت ہے ۔ لہذا اس کو بدلنے کا مطالبہ کرنا شریعت کو بدلنے کا مطالبہ ہے جو ناقابلِ قبول ہے ۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اگر افراد معاشرہ قانون سے ناواقف ہیں تو اس میں قصور کس کا ہے ؟ ظاہر ہے

(باقی ص۵۸ پر)